ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

اسلامی تہذیب کا تصور

نومبر ۱۹۵۸ء میں جناب جسٹس ایس۔ اے رحمٰن کے زیر صدارت ریڈیو پاکستان لاہور میں اسلامی تہذیب کے تصور پر ایک علمی مباحثہ ہوا تھا۔ جس کی ابتدا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی تقریر سے ہوئی۔ اور صدر مجلس کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک۔ مولانا حامد علی خاں ڈاکٹر برہان الدین احمد اور مظہر الدین صدیقی صاحب نے بھی اس مباحثہ میں حصہ لیا۔ خلیفہ صاحب کی تقریر اور مباحثہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

ابتدائی تقریر

اسلامی تہذیب کا کوئی تصور پیش کرنے سے پہلے اسلام اور تہذیب ان ہر دو تصورات کو متعین کرنا لازم معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب ہوگا کہ اسلام کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ تہذیب کا کیا مفہوم ہے اور شروع ہی میں اس ابہام کو رفع کرنا بھی ناگزیر ہے کہ تہذیب کو بعض اوقات تمدن کا مرادف خیال کیا جاتا ہے۔ فکر میں وضاحت پیدا کرنے والوں نے ان دو تصورات کا خلط ملط نہیں کیا اگرچہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بھی آسان کام نہیں اس لیے کہ کوئی تہذیب ایک خاص درجۂ تمدن کے بغیر ممکن نہیں اور کوئی تمدن تہذیب سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ انگریزی زبان میں سویلیزیشن اور کلچر کی اصطلاحوں میں بھی یہی ابہام ہے۔ اکثر مصنفوں نے ان کو ہم معنی سمجھ کر اپنی مرضی کے مطابق کبھی یہ لفظ استعمال کر دیا اور کبھی وہ۔ ہماری زبان میں تمدن سویلیزیشن کا قریب تر ترجمہ ہے اور کلچر کا مفہوم تہذیب کا لفظ بہتر ادا کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے تصور میں ہمیں تہذیب اور تمدن دونوں کے عناصر کو شریک کرنا ہوگا اور یہ بھی غور کرنا ہوگا کہ ایک کا دوسرے پر عمل اور ردِ عمل کس انداز کا ہوتا ہے۔

سویلیزیشن اور کلچر کے متعلق بھی ہم جب مغرب کے اہلِ فکر کے افکار کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں ایسی گوناگونی نظر آتی ہے جو لطف آفرین اور فکر انگیز تو ہوتی ہے لیکن تعریف و تحدید و تعیین میں کوئی وضاحت پیدا نہیں کرتی۔ مغربیوں کے افکار کے کچھ نمونے آپ کے سامنے بغرضِ تفکر پیش کرتا ہوں۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ کلچر کی مثال ایسی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتا ہو، اس میں شہد بھی ہوتا ہے اور موم بھی۔ شہد میں شیرینی بھی ہے اور غذا، دوا اور شفا بھی۔ قرآن کریم بھی اس کے متعلق کہتا ہے فیہ شفاءٌ للناس۔ چھتے میں جو موم ہوتی ہے اس سے منیر و مستنیر شمع بنتی ہے۔

انسان کو نورِ علم اور شیرینیٔ کردار دونوں کی ضرورت ہے اور کلچر کا لُبِّ لباب یہی دو عناصر ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تہذیب تربیت یافتہ فطرت کا نام ہے اور بہترین تہذیب و تمدّن وہ ہے جس کے اندر ہر فرد کو اپنی فطرت کے ممکنات کو معرضِ شہود میں لانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع میسّر ہوں۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ اصل تہذیب یہ ہے کہ انسان ملّتوں اور جماعتوں کے تعصّبات سے بلند تر ہو جائے۔ یہ وہی خیال ہے جس کو غالب نے اس شعر میں ادا کیا ہے:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کوئی کہتا ہے کہ تہذیب اخلاقی احساس کا نام ہے۔ مذہبی شخص کہتا ہے کہ مہذب زندگی وہ ہے جو خدا کی مرضی کے مطابق بسر کی جائے۔ کسی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انسان کی زندگی اس کو مسلسل کثافت اور جمود کی طرف کھینچتی رہتی ہے، اس سے بچنے کے لیے لطیف جذبات، لطیف تاثرات اور لطیف افکار میں زندگی بسر کرنا تہذیب ہے۔ ایک تصوّر یہ ہے کہ خارجی فطرت اور باطنی فطرت، انفس و آفاق ایک جنسِ خام ہے، اس کے اندر نظم و آئین کی تلاش اور آفرینش اور حسن و جمال اور توازن پیدا کرنا تہذیب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تہذیب اچھی عورتوں کے اثر سے پیدا ہوتی ہے اور ایک دوسرے مفکّر نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ کسی تہذیب کو جانچنے کا بہترین معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ بعض مفکّرین نے تہذیب و تمدن کے خراب پہلوؤں کی طرف توجّہ دلائی ہے۔ فرانسیسی حکما میں رُوسو ان کا امام شمار ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کو فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا لیکن تہذیب و تمدن نے اس کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی ہیں۔ ایڈورڈ کارپنٹر کی ایک مشہور کتاب ہمارے طالب علمی کے زمانے میں بہت پڑھی جاتی تھی۔ CIVILIZATION ,ITS CAUSE AND CURE یعنی سویلیزیشن ایک مرض ہے جو نوعِ انسان کو لاحق ہو گیا ہے، اب شدید ضرورت ہے کہ اس کی تشخیص کی جائے اور کوئی علاج تجویز کیا جائے۔ کسی کی تہذیب و تمدّن پر یہ کڑی تنقید ہے کہ اُس کی ترقی میں جمہور کو ذلیل کر کے خواص کو اُبھارا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جہاں ذاتی ملکیت اور خود غرضی نے آہنی دیواریں کھڑی کر رکھی ہوں اُس معاشرے کو مہذب نہیں کہہ سکتے۔ انسان کی ایک تعریف یہ ہے کہ وہ آلات استعمال کرنے والا حیوان ہے لیکن آلات کی ترقی سے اعضا نکمّے ہوتے جاتے ہیں، موٹر نشینوں کی ٹانگیں نیم جان ہو جاتی ہیں۔ ایک مُصلح مزاج مصنف لکھتا ہے کہ کوئی معاشرہ مہذب نہیں کہلا سکتا جس میں قید خانے اور پاگل خانے موجود ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہماری تہذیب اور تمدّن کو غور سے دیکھو تو انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہماری زمین عالمِ ارواح کا دارالمجانین ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ کسی تہذیب کو کامل نہیں کر سکتے کیوں کہ ہر تہذیب میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تخریب کے عوامل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ عرصۂ دراز تک آنکھوں سے اوجھل رہیں۔ اس کے متعلق بھی غالب کا یہ حکیمانہ شعر ہے:

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

اس مختصر اذکار پیمائی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تہذیب و تمدن کا مفہوم کس قدر مبہم ہے۔ اور سنیئے کارلائل اپنے دور کی مغربی تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تہذیب تین عناصر پر مشتمل ہے: بارود، چھاپہ خانہ اور پراٹسٹنٹ مذہب۔ تہذیب و تمدن کے متعلق بعض اعلیٰ درجے کے مفکرین جن کی عقلیت اور روحانیت عام طور پر لطیف اور دور رس تھی ایسی بھٹکی ہوئی باتیں بھی کہہ گئے ہیں۔ جیسا ایمرسن کا یہ فتویٰ کہ اعلیٰ تہذیب گرم ملکوں میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی، سیاست، معیشت اور معاشرت میں آزادی وہیں ملتی ہے جہاں برف باری ہوتی ہو۔ جس گرم آب و ہوا میں کیلے اُگتے ہوں وہاں انسان ہوس پرست اور ظالم ہوتے ہیں۔ ایمرسن جیسا بالغ نظر ادیب اس سے زیادہ اور کہیں نہیں بھٹکا۔ لطیفہ یہ ہے کہ مسلمان مصنفین ابن خلدون کے زمانے میں نہایت سنجیدگی سے اس پر بحث کیا کرتے تھے کہ یورپ والے اس قدر غبی کیوں ہوتے ہیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتے تھے کہ اُن کی سرد آب و ہوا اور برف باری ان کے افکار کو منجمد کر کے عقلی نشو و نما کا موقع نہیں دیتی۔

ان افکار اور لطائف سے گزر کر ہم اب اسلامی تہذیب کے تصور کو متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کا ماخذ قرآن اور اُس برگزیدہ ہستی کا کردار ہے جس نے اپنے قول و فعل سے تہذیب کا ایک خاکہ اور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہاں پھر تہذیب اور تمدن میں امتیاز کرنا پڑے گا۔ اسلام نے پہلے اس قوم کی سیرت کو ڈھالنے کی کوشش کی جس کا تمدن زیادہ تر قبائلی تمدن تھا۔ عرب کے گرداگرد ایسی قومیں تھیں جو ہزارہا سال سے تہذیب و تمدن کی کئی منزلیں طے کر چکی تھیں مگر عربوں کے پاس نہ کوئی علوم تھے اور نہ کوئی فنون۔ فنونِ لطیفہ میں سے فنِ شعر کے سوا اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔ قرآن سے پہلے عرب میں کوئی کتاب نہ تھی۔ ہندوستان، بابل، مصر، یونان، چین اپنے اپنے دور میں علوم و فنون اور اسبابِ تمدن میں حیرت انگیز ترقی کے نمونے چشمِ روزگار کو دکھا چکے تھے۔ اسلام کے پاس کوئی علوم نہ تھے جنہیں قوموں کے سامنے بطورِ مثال پیش کر سکتے۔ اہلِ ایران، اہلِ روما اور اہلِ مصر تمدن کے لحاظ سے عربوں کے مقابلے میں ہزارہا فرسنگ آگے تھے۔ اسلام کو پیش کرنے والا انقلابی نبیؐ ان تمدنوں کے اکثر پہلوؤں سے آشنا تھا۔ وہ گرد و پیش کے مذاہب کا بھی جائزہ لے چکا تھا، وہ قدیم تمدنوں کی داستانیں بھی سُن چکا تھا، اور ان کے عروج و زوال کا نقشہ بھی اس کی چشمِ حقیقت شناس کے سامنے تھا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمدنوں، تہذیبوں اور مذہبوں کو گھن لگ چکا ہے۔ عشرت کے سامان ظلم سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ ظاہری حسن و جمال کی تہہ میں ایک گہری بے دردی ہے۔ انسان ہر جگہ طرح طرح کے استبداد کا شکار ہیں۔ مذہبی استبداد کی وجہ سے انسانوں پر روحانی غلامی طاری ہے۔ اقتصادی لحاظ سے انسان بے بس ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ثمر کوئی دوسرا کھاتا ہے۔ سود خوار مردم خوری کر رہے ہیں اور انسانوں کو محتاج اور غلام بنا رہے ہیں۔ حکمران اپنے کو لوگوں کی عزت اور جان و مال کا مالک سمجھتے ہیں۔ مذہب ہر جگہ بھٹک گیا ہے۔ لوگ رہبانیت کو روحانیت سمجھتے ہیں، اور دوسری طرف احبار اور مذہبی پیشوا حکمرانوں اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ میں شریک اور معاون ہیں۔ مساوات

انسانی کا تصور کسی انسان کے ذہن میں بھی نہیں گزرتا۔ مرد عورتوں کو مال مویشی کی طرح اپنی جائداد سمجھتے ہیں۔ مذہبوں اور تہذیبوں نے نسائیت پر تذلیل کی مُہر لگا رکھی ہے۔ حصولِ علم کے دروازے جمہور پر بند ہیں۔ اس مصلح نے اپنا مشن یہی قرار دیا کہ انسانوں کو ہر قسم کی غلامی اور استبداد سے آزاد کیا جائے اور ایک ایسا معاشرہ پیدا کیا جائے جس کی بنا حرّیت، عدالت اور رحمت پر قائم ہو۔ لوگوں کو صلح کا پیغام دیا جائے اور جو گروہ صلح جوئی اور اس نئے عادلانہ معاشرے کی راہ میں حائل ہوں اگر وہ تعلیم و تلقین سے راہ پر نہ آئیں تو ان کے خلاف ہر قسم کی قوت کو استعمال کیا جائے۔ انسانی معاشرے میں فتنوں کا سدِّباب کیا جائے۔ ضمیر کی آزادی کے لیے اگر ضرورت ہو تو جنگ کی جائے مگر دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہ کیا جائے۔ نہ جبرِ خفی اور نہ جبرِ جلی۔ حکمرانوں کو یہ بتایا جائے کہ وہ قوم کے خادم ہیں اور حکومت کو ذاتی جلبِ منفعت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ جو گروہ فتنے سے باز رہے وہ اپنے عقائد پر اپنے انداز سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ذمّی کی جان و مال و آبرو کو مسلمان کی جان و مال اور آبرو کے برابر سمجھا جائے۔ قبیلوں، قوموں اور ملتوں میں سے تعصّب اور تفوّق کے احساس کو دور کیا جائے۔ اور یہ اعلان کیا جائے کہ کسی عرب کو بحیثیت عرب کسی غیر عرب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں اور نہ کوئی غیر عرب ملّت ہی بحیثیتِ ملّت عربوں پر فائق ہے۔ انسانوں میں فرق صرف سیرت اور کردار اور زندگی کے نصب العینوں کے تفاوت سے پیدا ہوتا ہے۔ کوئی گروہ نجات کا اجارہ دار نہیں۔ انسانوں کو یہ تلقین کی جائے کہ وہ توہّم آفرینی اور اعجاز طلبی کی بجائے اپنی فطرت اور خارجی فطرت کے مظاہر کا مطالعہ کریں۔ تمام مظاہرِ فطرت آیاتِ الٰہی ہیں اس لیے فطرت میں آئین کا متلاشی حقیقت میں خدا کا طالب ہے کیوں کہ خدائے واحد ہی فطرت کی کثرت میں وحدت آفرین ہے۔ ہر فرد کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع مہیا کئے جائیں۔ معاشرہ دولت پیدا کرے لیکن اس کا نگران رہے کہ دولت ظلم سے پیدا نہ ہو اور وہ چند افراد کے ہاتھوں میں گردش نہ کرتی رہے۔ قیصریت اور کسرائیت کا خاتمہ کیا جائے لا قیصر ولا کسریٰ کا نعرہ بلند کیا جائے۔ اسلام نے انسانوں کو یقین دلایا کہ جو تمدن ان بنیادوں پر قائم ہو گا وہی انسانیت کا دفار قائم کرے گا۔ وہ انسان کے لیے لامتناہی ارتقار کے دروازے کھول دے گا۔ چنانچہ انسانوں نے دیکھ لیا کہ یہ پیش گوئی سچّی تھی۔ اسلام جب حجاز سے نکلا ہے تو اس کے پاس ایک نظریۂ حیات کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ علوم نہ فنون نہ اعلیٰ درجے کے آلات نہ سامانِ عشرت نہ صنعتوں کے نظر افروز نمونے۔ بقول اقبال:

غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

اس بانگِ درا کے ساتھ یہ قافلہ ایسی تیز رفتاری سے چلا کہ مشرق اور مغرب کے ڈانڈے مل گئے۔ مسلمان راستہ چلتے ہوئے متمدن قوموں کے علوم و فنون کو اپنا گم شدہ مال سمجھ کر اپناتا گیا۔ اس کے پاس ابتدا میں کچھ نہ تھا لیکن وہ نوعِ انسان کے ہزارہا سال کے ارتقار میں حاصل کردہ علوم و فنون کا وارث ہو گیا۔ اس نے اس دولت کو صرف بچایا اور اپنایا ہی نہیں بلکہ اس کو بڑھایا۔ تمام علوم و فنون میں ایک نئی روح پھونکی جس سے ان کی ہیئت بدل گئی۔ ارسطو اور

افلاطون سے بہتر مفکر پیدا کئے۔ اہرام فراعنہ اور پارتھینان سے بہتر تعمیریں کھڑی کیں اور پھر ان تعمیروں کے گارا اور چونہ غلاموں کے خون سے نہیں گوندھا گیا۔

لیکن افسوس ہے کہ یہ تہذیب اور یہ تمدّن بھی جو حرکت کو برکت سمجھتا تھا اور ارتقار کوش و خلاّق تھا مرورِ ایام سے جامد ہونا شروع ہوگیا۔ حکمرانوں کا استبداد بڑھ گیا اور وہ رعیت کے راعی نہ رہے۔ وہ خداؤں نے کاشت کاروں کو غلام بنالیا۔ اور دین کی یہ حالت ہوئی کہ :

حرم جویاں درے رامی پرستند　　فقیہاں دفترے رامی پرستند

بعض عالمانِ دین نے یہودی احبار کا رویہ اختیار کرلیا اور برہمنوں کی طرح فرض شناس ہونے کی بجائے طبقاتی تفوّق کے ذلیل جذبے کا شکار ہوگئے۔ ابتدائی صدیوں میں مسلمان فقہا تغیّر حالات کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون میں وسعت پیدا کرتے رہے لیکن بعد کے فقہار میں اجتہاد کی صلاحیت نہ رہی اور انہوں نے یہ پکارنا شروع کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔ جابر سلطانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے مفقود ہوگئے، علوم کی ترقی رُک گئی۔ دین جامد ہوکر افسردہ و پژمردہ ہوگیا۔ حکمرانوں اور علماءِ سُو نے مل کر جمہور کو جاہل اور بے بس بنا دیا۔ ترقی کی مشعل اُن کے دستِ شل سے گر گئی اور دوسروں نے اُٹھالی ؎

بجھ کے شمع ملّتِ بیضا پریشاں کرگئی　　اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کرگئی
دورِ گردوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے　　پل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

اس وقت مسلمان پسماندہ ہے اس کے پاس اسبابِ حیات نہیں۔ علوم و فنون میں اور اصلاحِ معاشرت میں دوسری قومیں اس سے کوسوں دُور نکل چکی ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تہذیب کے اسی تصوّر کا احیا کیا جائے جو ہر قسم کی ترقی اور حریّت کا ضامن تھا۔ دین کو اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ اسلام جن رجحانات کا نام تھا ان کو دوبارہ بروئے کار لایا جائے۔ دین کو عقائد کی فروعی جنگ سے چھڑایا جائے۔ انسانوں میں حقوق کے لحاظ سے وہ مساوات قائم کی جائے جس کا نمونہ رسول کریمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تہذیب و تمدّن کی بنا عدل و رحمت پر رکھی جائے۔ زندگی میں حسن و جمال پیدا کیا جائے۔ حصولِ علم کا جذبہ بیدار ہو اور انسانیت کا معیار زر و مال نہ ہو۔ گفتار نہ ہو بلکہ کردار ہو۔ اسلامی تہذیب کا تصوّر ایک لامتناہی ارتقارِ حیات کا تصوّر ہے اس کی تکمیل کے لیے تقلید سے زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ اور تحقیق سے زیادہ زندگی کو اس کے مطابق بنانے کی سعی بلیغ۔

بعض ذہنوں میں شاید یہ سوال اُبھرے گا کہ اگر غیر مسلم قومیں بھی حیرت انگیز ترقی کرسکتی ہیں تو اسلام کی کیا ضرورت ہے۔ اور اسلامی تہذیب میں کیا خصوصیت ایسی ہے جو اس کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرسکے بعض

لوگ کہتے ہیں کہ انگریز ہم سے بہتر مسلمان ہیں۔ اسلامی صفات میں سے اگر ہمارے پاس پانچ فی صدی سرمایہ رہ گیا ہے تو انگریزوں کی زندگی میں پچاس فی صدی موجود ہے۔ انگلستان میں چور بازاری نہیں۔ حاکموں میں رشوت ستانی نہیں۔ ہر فرد کو تعلیم و ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ کمال درجے کی مذہبی رواداری موجود ہے۔ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ کسی شخص کو محض ذاتی اور مذہبی عقائد کی بنا پر نہ کوئی فوقیت حاصل ہوتی ہے اور نہ زندگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوتی ہے۔ مملکت نے ہر فرد کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا ہے، مملکت ہر فرد کی صحت کی ضامن ہے۔ اسلامی ممالک میں کہیں اس وقت کوئی رفاہی مملکت نہیں ہاں کہیں کہیں ابتدائی کوشش نظر آتی ہے۔ اشتراکی خواہ روسی ہوں یا چینی رفاہِ عام کے راستوں پر تیزی سے گام زن ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم انگریزوں کو نمونہ سمجھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی اصلاح کی طرف قدم اٹھائیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں اشتراکیت اس سے بہتر رہے گی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم ان زندہ تحریکوں اور تہذیبوں کے مقابلے میں عصرِ حاضر میں کسی اسلامی مملکت یا معاشرے کو پیش نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس محض ایک نصب العین اور زاویۂ نگاہ ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی جو ایک جیّد عالم اور پختہ عقیدے کے مسلمان ہونے کے علاوہ ایک انقلاب پسند طبیعت رکھتے تھے ایک مرتبہ اسٹالن سے جا ملے اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک نصب العینی خاکہ اس کے سامنے پیش کیا۔ سب کچھ سُن کر اسٹالن نے پوچھا کہ کونسی اسلامی مملکت اس کو عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ عملاً اس تجربے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کار بند تو اس پر اس وقت کوئی بھی نہیں لیکن ہمارا ایمان اور مقصودِ حیات یہی ہے۔ اس پر اسٹالن نے جواب دیا کہ جب کوئی قوم اس پر عمل کرے گی تو پھر ہم کوئی رائے قائم کریں گے۔ اگر اس کا جواب ہم یہ دیں کہ اصلی اسلام نے ابتدا میں ایک نمونہ پیش کیا تھا اُس سے ہمارے نصب العین کا اندازہ کر لیجئے تو سُننے والا کہہ سکتا ہے کہ چودہ سو برس قبل کے حالات اور موجودہ تقاضوں میں اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ اس زمانے میں اس تجربے کو دہرایا نہیں جا سکتا تو یہ اعتراض ایک حد تک درست ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں سے ہماری ترقی رُک گئی ہم اسلام سے پیچھے ہٹتے گئے اور بعض دیگر اقوام اصلاحی کوششوں میں سُرعت کے ساتھ ہم سے آگے نکلتی گئیں:

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

لیکن مایوسی کفر ہے۔ ملتوں کا زوال و کمال ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہزاروں برس کی خفتہ رجعت پسند اور جامد قومیں یک بیک بیدار ہو کر اپنی کایا پلٹ چکی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ کے لیے پس ماندہ رہیں۔ اب اوّلیں ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے نصب العین میں وضاحت پیدا کریں اور جدید زندگی کے

حقائق کو نظر انداز نہ کریں۔ پہلے بھی ہم نے ترقی یافتہ تہذیبوں اور تمدنوں کے ساتھ خذ ما صفا اور دع ما کدر کا عمل کیا تھا۔ اب بھی ہم کو دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھانا اور بہت سی باتوں میں ترقی یافتہ قوموں کی شاگردی کرنی ہوگی۔ لیکن ہمارا نصب العین اسلام نے معین کر دیا ہے۔ اس کی ہم وضاحت تو کر سکتے ہیں اور زندگی پر اس کا نیا اطلاق بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میں ردّ و بدل نہ ایماناً ہو سکتا ہے اور نہ عقلاً۔ اسلام اساساً ایمان باللہ اور خدمتِ خلق کا نام ہے۔ وہ انسانوں میں سے مصنوعی تقسیمیں مٹانا چاہتا ہے۔ وہ نسلی یا جغرافیائی یا لسانی قومیت کو زندگی کی اساس نہیں بنا سکتا۔ اسلام حریت اور مساوات کی کوشش ہے۔ وہ ہر قسم کے استبداد کو مٹانا چاہتا ہے۔ وہ انسانوں کو عدالت، رحمت، حکمت اور عفت کو جزوِ زندگی بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ دولت اور قوت کو ذریعہ سمجھتا ہے مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا۔ اسلامی تہذیب کی بنا الحاد نہیں بلکہ توحید ہے وہ زندگی میں طبیعی اور اخلاقی اور روحانی جمال پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک طرف رہبانیت اور دوسری طرف دنیا طلبی سے روکتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام اچھے نصب العینوں کا جامع ہے، وہ غیر قوموں کے کمالات کو اپنانا بھی اپنی توہین نہیں سمجھتا۔

اگر اسلام یہی ہے تو زندگی کا کوئی نصب العین جو انسانی زندگی کو بہتر بنا سکے اس سے خارج نہیں ہو سکتا۔ ہمارا حال خراب ہے لیکن اگر ہمارا زاویۂ نگاہ حقیقی اسلام کے مطابق ہو تو ہمارا مستقبل ہمارے ماضی سے بھی زیادہ درخشندہ ہو سکتا ہے۔

مباحثہ

جسٹس رحمان: سالک صاحب! کیا آپ اس تقریر کے کسی گوشے پر روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

عبدالمجید سالک: بات یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے متعلق جو کچھ خلیفہ صاحب نے ارشاد فرمایا وہ اپنی جگہ تو درست ہے لیکن اسلامی تہذیب کا صحیح تصوّر وہی ہے جو قرآن مجید اور سنّتِ رسول میں ہم کو ملا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اسلام اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ جس وقت مسلمانوں نے اس تہذیب کو اختیار کیا تو صحیح طور پر اختیار کرنے کے چند سال ہی نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ کے وصال کے پچاس سال بعد ہماری تہذیب کے جو بنیادی تصوّر تھے وہ قریب قریب سب فراموش ہو گئے۔ خلافت کی جگہ ملوکیت آ گئی، سرمایہ داری اور دولت مندی بھی شروع ہو گئی دوسروں کی کمائی پر لاکھوں کروڑوں روپیہ فراہم کرنا اور عیش و عشرت کرنا بھی شروع ہو گیا اور اس کے بعد جناب! جانشینی کی جنگیں اور بادشاہوں کا قتل اور پھر خلفاء کی عیاشیاں اور یہ تمام چیزیں عام ہو گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں جب اسلام اپنے دنیاوی اعتبار سے انتہائی عروج پر تھا۔ اس وقت اگر کوئی نقاد اس پر رائے دیتا تو اس کو بھی معلوم ہوتا کہ اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر کا اس زندگی میں نام و نشان تک نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی ظاہری

شکل اسلامی تہذیب پر مبنی معلوم ہوتی تھی لیکن حقیقت میں اس زندگی کو اور اس کی معاشرت کو اسلامی اقدار سے اور تہذیب کے اسلامی تصور سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ہمارے یہاں ہندوستان میں مغل سلطنت بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ بڑے جاہ و جلال کے ساتھ قائم رہی لیکن ایک آدھ آدمی کے سوا باقی سلاطین اور ان کے اُمرار اسلامی تہذیب سے اُتنے ہی دُور تھے جتنے غیر مسلم دُور ہو سکتے ہیں سوائے بعض ظاہری عبادات اور معاملات کے۔ جناب خلیفہ صاحب نے جب تہذیب کے سلسلے میں علوم و فنون کے حصول کا ذکر کیا تو اُس میں یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ اُن علوم و فنون کے اختیار کرنے میں مسلمانوں نے آیا اپنے بُنیادی تصوراتِ تہذیب کا خیال رکھا یا نہیں رکھا؟ جہاں تک فنونِ لطیفہ کا تعلق ہے یہ بالکل صحیح ہے کہ عربوں کے پاس شعر کے سوا کوئی فنِ لطیف موجود نہیں تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ کی تو پہلی صدی ہی میں موسیقی نے، مزامیر والی موسیقی نے، ایسی شکل اختیار کی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے یا صدیقؓ و فاروقؓ کے سامنے بالکل روا نہ رکھی جاتی۔ اور اس کے بعد جب انہوں نے مصوری اختیار کی تو وہ ساری ہی اسلام کے بنیادی تصوراتِ تہذیب کے خلاف تھی اور اسی قسم کے دوسرے فنونِ لطیفہ جو اسلام میں بالکل ناجائز تھے وہ اختیار کئے اور اس کو بھی آج کل کے لوگ اپنی تہذیب اور تمدن کا سرمایہ سمجھتے تھے۔

جسٹس رحمان: ۔ سالک صاحب! فنِ تعمیر کے متعلق اس بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

عبدالمجید سالک: ۔ فنِ تعمیر کے متعلق میری گزارش یہ ہے کہ اگر اسلام کے بنیادی تصورات جن میں حضورؐ نے اور بعد میں خلفائے راشدین نے عمل کیا اگر وہ تصورات پیشِ نظر رکھے جائیں تو میرے خیال میں فنِ تعمیر پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنا بھی تبذیر اور اسراف سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ اور اسی طرح دوسری چیزوں پر اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف فتویٰ دیا جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ خلیفہ عبدالحکیم کہہ سکتے ہیں کہ میرا منصب تو صرف اسلامی تہذیب کا تصور پیش کرنا تھا۔ سو میں نے پیش کر دیا۔ مجھے اس بات سے کیا واسطہ کہ کسی نے اس پر عمل کیا ہے یا نہیں کیا۔ لیکن بہر حال تصور تو انہیں لوگوں کے ساتھ قائم ہوتا ہے جو ان تصورات کو پیشِ نظر رکھیں اور ان کے مطابق عمل کریں۔ ایسے آدمی سوائے پہلوں کے ہمیں تو نظر نہیں آتے۔ بہت ہی کم خال خال تاریخ میں ہمیں نظر آئیں گے ایسے لوگ جنہوں نے تہذیب اور ثقافت اور تمدن کے اُس تصور کے مطابق اختیار کیا جو تصور کہ حضورؐ نے ہم کو دیا۔ سو میرا خیال ہے کہ اس تقریر کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیب کے متعلق بھی خلیفہ صاحب کچھ ارشاد فرمائیں تو بہتر ہو یعنی اسلامی تہذیب کا تصور نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیب کا تصور۔ پھر شاید اُس میں وہ چیزیں بھی آسکیں جو اُس تقریر میں انہوں نے دانستہ چھوڑ دی ہیں۔ کیونکہ بڑی چالاکی کے ساتھ لکھی ہوئی تقریر ہے یہ! (قہقہے) . . . . . اور یہ بھی واضح ہو جانا چاہیئے کہ یہ جو تہذیب ہے، یہ کیا چیز ہے اور تمدن کیا شے ہے؟ اور ثقافت کس کو کہتے ہیں؟ تاکہ ہم ان کے متعلق الگ الگ

اندازہ کر سکیں۔ یہ جتنی چیزیں اسلامی تہذیب کے تصور میں خلیفہ صاحب نے بیان کی ہیں اُن اقدار کو تو اللہ کے فضل سے اور رسول اللہ کی برکت سے اب تمام دنیا مانتی ہے اور جو سرمایہ دار ممالک ہیں ان کی کثرتِ آبادی بھی اب سرمایہ داری کو مبغوض سمجھنے لگی ہے اور اخلاق کی لغزشیں جو تمام متمدن دنیا سے اس وقت سرزد ہو رہی ہیں اُن کے خلاف بھی ہر ملک سے ہر وقت ہر زبان میں آواز بلند ہو رہی ہے۔ وہ تو بالکل صحیح اور پکی باتیں ہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اور جو کچھ وہ کہے گا وہی انسانیت کے لیے مفید ہوگا۔ اور تمام انسان مجبور ہوں گے کہ اس کو اختیار کریں۔ لیکن اب آپ اس سے ذرا آگے بڑھیئے۔ تہذیب کے دوسرے عناصر کے متعلق اسلام نے جو کچھ سکھایا اور جو تصورات دیئے وہ میرے خیال میں ابھی تک پورے نہیں ہوئے۔ البتہ ان میں تجاوزات کئے گئے۔ پہلے مسلمانوں نے کئے اپنی تہذیب کے زمانے میں اور اس کے بعد آج مغربی قومیں اس سے بھی زیادہ تجاوز کر رہی ہیں اور ہم ہیں کہ مغرب سے اس ثقافت کو لے کر سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اسلام کی خدمت ہے۔ اور اس ثقافت کو تقویت دینا بھی اسلام ہی کے لیے مفید اور اسلامی تصوراتِ تہذیب کے مطابق ہے۔ اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ خلیفہ صاحب کی تقریر کسی قدر نامکمل رہی۔

مظہر الدین صدیقی: ۔ جناب سالک صاحب نے فرمایا ہے کہ اسلام کے پچاس سال کے بعد اسلامی تہذیب کا ظاہری ڈھانچہ تو باقی رہا لیکن اُس کے اندر جو اصل روح تھی وہ فنا ہو گئی اور اسلام نے زندگی کی جو تشکیل کرنی چاہی تھی وہ بہت کچھ بگڑ گئی۔ مجھے جناب سالک کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے دور میں اسلام سے بہت کچھ انحراف کیا گیا لیکن اسلام نے جو اثرات چھوڑے تھے وہ اتنے قوی تھے کہ وہ بہت عرصے تک باقی رہے اور اُسی شد و مد سے باقی رہے۔ مثلاً آپ صرف نظامِ غلامی کو لیجئے۔ اسلام نے جس طرح اس نظام کو بدلا تھا وہ پھر اسلام کے بعد اور خلافتِ راشدہ کے بعد اپنی اصل حالت پر عود نہ کر سکا۔ اسلام نے حکم دیا تھا کہ بجز جنگوں کے اور کسی طرح لوگوں کو غلام نہ بنایا جائے۔ لیکن دوسرے ممالک میں غلامی کے دوسرے طریقے بھی رائج تھے۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی شخص مقروض ہو جاتا اور قرض ادا نہ کر سکتا تو اس کو غلام بنا دیا جاتا تھا۔ اسلام کے بعد پھر یہ صورت کبھی پیدا نہ ہوئی۔

جسٹس رحمان: ۔ معاف کیجئے قطع کلامی ہوتی ہے صدیقی صاحب! مگر یہ کیا صحیح نہیں ہے کہ خلفائے عباسیہ کے وقت میں غلاموں کی فروخت بھی ہوتی تھی منڈیوں میں؟

مظہر الدین صدیقی: ۔ یہ وہی غلام تھے جو کہ جنگی قیدی بن کر آئے تھے۔

جسٹس رحمان: ۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ افریقہ سے بھی غلاموں کو لایا جاتا تھا اور فروخت کیا جاتا تھا؟

مظہر الدین صدیقی: ۔ ممکن ہے اس قسم کی چند استثنائی مثالیں نظر آتی ہوں لیکن عام طور پر ایسا نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسلام نے ملوکیت کے خلاف جو تحریک چلائی وہ بہت حد تک کامیاب رہی۔ اس میں

شک نہیں کہ بنی امیہ اور بنی عباس نے ایک حد تک مطلق العنانی شروع کر دی لیکن وہ شریعتِ اسلامیہ کے پابند تھے اور اس قسم کی مطلق العنانی نہیں کرتے تھے جیسی کہ اُن سے پہلے دنیا میں رائج تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ تُرکوں نے جس وقت اسلام قبول کیا تو ان کا قومی قانون "یاسہ" تھا جس کے تحت بادشاہ کو غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ پس بہت عرصہ تک تُرکوں کے مزاج اور اسلامی شریعت میں تصادم ہوتا رہا لیکن بالآخر شریعتِ اسلامیہ کا اثر اُن پر غالب آگیا۔

جسٹس رحمان: ۔ تو صدیقی صاحب آپ کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی اقدار بہت حد تک معاشرہ میں سرایت کر چکے تھے اور ان کا اثر دیرپا ہوا۔

مظہر الدین صدیقی: ۔ جی ہاں میرا مطلب یہ ہے کہ باوجود اُس انحراف اور بغاوت کے جو اسلام کے خلاف شروع ہوئی اسلام کی تحریک اتنی زبردست تھی کہ اُس کے اثرات کو زائل نہ کیا جا سکا۔

جسٹس رحمان: ۔ خلیفہ صاحب آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ارسطو اور افلاطون سے بہتر مفکّرین اسلام میں بھی پیدا ہوئے وہ کون سے مفکّرین تھے؟ آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ فلسفے میں جو کچھ مسلمانوں کو پہنچا اور جو کچھ مسلمانوں نے پیش کیا وہ یونانی فلسفے کا چربہ تھا؟

خلیفہ عبدالحکیم: ۔ یہ ایک عام خیال مغرب کے مستشرقوں نے پھیلا رکھا ہے کہ مسلمانوں نے اس سے زیادہ کیا کیا کہ یونانیوں کے جو علوم تھے اور جنہیں لوگ فراموش کر چکے تھے انہیں گویا اکھاڑ کر اور ان کی مٹی جھاڑ کر دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ خود ہمارے بعض مسلمان طلباء جنہوں نے کالجوں میں نیم پختہ سی جدید تعلیم پائی وہ بھی اسی قسم کی باتیں سُن کر دہراتے رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو اس کی پوری واقفیت نہیں ہے۔ مثلاً الٰہیات ارسطو اور افلاطون دونوں میں موجود ہے۔ اُن کے مقابلے میں آپ غزالی اور رومی کی الٰہیات دیکھئے اور ان کے فلسفہ دین کو دیکھئے، دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اُن کو کوسوں دُور پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ پھر فارابی ہے بوعلی سینا ہے جالینوس کی طب ان سے پہلے موجود تھی اور بقراط کی طب بھی، لیکن خود یورپ اب اس پر تحقیق کر کے آپ کے سامنے یہ پیش کر رہا ہے کہ بوعلی سینا اعلیٰ درجے کا محقق تھا اور اس نے طب میں ایسی تحقیقات کی اور ایسی باتیں پیش کیں جو یونانیوں کے خواب میں بھی نہیں آئی تھیں۔ اسی طرح زندگی کے اور شعبوں کو دیکھئے۔ مثلاً یونانیوں کی سائنس کیا تھی؟ ان کی فزکس (PHYSICS) میں افلاطون، ڈیموقراطیس یا ارسطو نے جو کچھ لکھا اس کے مقابلے میں مسلمانوں نے تجرباتی سائنس شروع کی اور کیمسٹری کو جو اس سے پہلے بطور سائنس موجود نہ تھی مسلمانوں نے بہت ترقی دی۔ اسی طرح ہر فن میں انہوں نے پہلے لوگوں سے کچھ نہ کچھ لیا ضرور ہے لیکن پھر اُسے جوں کا توں رکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ خود بوعلی سینا ہوں یا فارابی ہوں اُن کے بہت سے افکار اور عقلیات میں ان کی بنیادی چیزیں ارسطو

افلاطون، پلاٹینس سے لی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اسلام کی آمیزش سے ہر چیز کا رنگ بدل جاتا ہے اور وہ ایک نئی چیز بن جاتی ہے۔ چنانچہ بوعلی سینا کے یہاں جو روحانیت ہے وہ ارسطو اور افلاطون سے مختلف ہے۔

جسٹس رحمان: ۔ ڈاکٹر برہان الدین احمد صاحب آپ کیا اس مسئلے پر کچھ اظہارِ خیال فرمائیں گے؟ میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ علامہ اقبال کا یہ خیال تھا کہ روحِ اسلام یونانی تفکرات کے منافی ہے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر برہان الدین احمد: ۔ یونانیوں کے نزدیک حقیقت معقولات میں مضمر ہے اور محسوسات حقیقت نہیں ہیں۔ علامہ اقبال کا اشارہ یونانی فکر کو اسلام کے منافی کہنے سے یہ ہے کہ بہ خلاف یونانی فکر کے اسلام کا موقف یہ ہے کہ محسوسات بھی حقیقت ہیں اور اسی لیے وہ قرآن کی تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں کلاسیکی فلسفۂ یونان کے نقطۂ نگاہ کو۔

جسٹس رحمان: ۔ حامد علی خاں صاحب آپ اس بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ خلیفہ صاحب کا ارشاد ہے کہ قرآن سے پہلے عربوں کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ آیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ کوئی ادب ہی نہیں تھا یا کوئی تصنیف لکھی ہوئی موجود نہ تھی؟

حامد علی خاں: ۔ غالباً ان کی مراد لکھی ہوئی تصنیف سے ہے کیونکہ اسلام سے پہلے عربوں کی شاعری ایسے بلند معیار کو پہنچ چکی تھی کہ اُس کے بعد غالباً کبھی اس درجے کو نہیں پہنچی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں خلیفہ صاحب نے جہاں یہ فرمایا ہے کہ عربوں کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی اُن کا مطلب لکھی ہوئی کتاب سے ہے، ورنہ مُعلّقات اور دوسری چیزیں وہاں موجود تھیں جو لٹکا دی جاتی تھیں اور اس پر عرب فخر کرتے تھے۔ مجھے کچھ اور سوالات خلیفہ صاحب سے کرنے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم: ۔ فرمائیے۔

حامد علی خاں: ۔ ایک جگہ آپ نے ثقافت اور تہذیب کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا ہے اور غالباً تمدّن کو بھی۔ تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو تصوّرات آپ نے اسلامی تہذیب کے متعلق پیش کئے تھے وہ کیا صرف دینی احکام نہیں ہیں؟ یعنی اس کو ہم کسی کلچر یا ثقافت کی اساس تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان کو تہذیب یا تمدّن کا نام دینا کہاں تک درست ہے! کیونکہ جس ثقافت پر ہم ناز کرتے ہیں وہ خلافتِ راشدہ کے بعد پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی وہ ثقافت جس کے مظاہر ہمیں یورپ اور ایشیا میں ملتے ہیں اُن میں جیسا کہ سالک صاحب نے فرمایا ہے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کی متصوفانہ یا فقیرانہ روح سے مختلف ہیں۔ مثلاً ہم دلّی کی مسجد اور لال قلعے پر فخر کرتے ہیں۔ قصر الحمراء پر بھی ہمیں ناز ہے۔ اسی طرح لاہور کے قلعے اور اورنگ زیب کی مسجد پر بھی ہمیں فخر ہے لیکن بقول سالک صاحب ان مسجدوں اور مقبروں اور دوسری تعمیرات کے سنگِ مرمر، سنگِ سُرخ، اور اس قسم کی بیش قیمت چیزیں اور ان پر مینا کاری یہ سب کچھ اسلامی تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ اسلام ایک درویشانہ مذہب ہے۔ مجھے یہ پوچھنا ہے کہ جو چیزیں آپ نے پیش کی ہیں کیا وہ صرف مذہب کی تلقین یا مذہبی تصوّرات ہیں یا یہ وہی کلچر یا ثقافت ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ وہ ثقافت کیا ہے؟ اس کے متعلق....

خلیفہ عبدالحکیم:۔ حامد علی خاں صاحب سے پہلے سالک صاحب نے کچھ اعتراض اٹھائے ہیں۔ ان دونوں اعتراضوں میں کچھ مماثلت بھی ہے۔ سالک صاحب کے اعتراض سُن کر مجھے کچھ تعجب ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تقریر بڑی چالاکی سے لکھی ہے مگر انہوں نے اعتراض بھی بڑی چالاکی سے کئے ہیں۔ اُن کا ایک مختصر سا جواب میں یوں دے سکتا ہوں — کہا جاتا ہے کہ اسلام کی اصل ابتدائی زندگی درویشانہ زندگی تھی۔ میں تو خود پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہاں تمدّن، ثروت، دولت، تعمیر، فنون اور صنعتیں یہ چیزیں ابھی تک موجود نہ تھیں۔ جب یہ چیزیں کسی کے پاس نہ ہوں گی تو ظاہر ہے کہ وہ درویش شمار ہوگا۔ اُس وقت بہت کم مسلمان ایسے تھے جن کے پاس دو کُرتے ہوں۔ اور آپ میں سے بعض کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ اس وقت جو لوگ نماز پڑھنے آتے تھے اُن میں سے اکثر کے پاس تہہ بند تو ہوتا تھا لیکن کُرتا نہیں ہوتا تھا۔ یہ اُن کی حالت تھی۔ اب کوئی سمجھے کہ اسلام بس وہی فقر تھا، لیکن یہ اسلام نہیں، یہ تو آپ عیسائیت اور رہبانیت کا تصور پیش کر رہے ہیں۔ رسولِ کریمؐ نے کہا کہ میں دعا مانگتا ہوں خدا سے کہ یہ میری قوم مفلس ہے اس کے پاس کھانے کو کم ہے۔ اس کو اچھے کھانے کھلا۔ اس کے پاس کپڑے نہیں۔ اسے اچھے کپڑے دے۔ اس کے پاس سرمایۂ حیات نہیں۔ اس کو سرمایہ دے۔ میں ایک تمثیل سے غالباً اپنا مطلب زیادہ واضح کر سکوں گا۔ میرے نزدیک اسلام کی یا کسی اور بڑی تحریک کی مثال ایک بیج کی سی ہے۔ اچھے بیج کی۔ آپ کسی شاندار درخت کو، کسی پھول پھل نکالنے والے درخت کے بیج کو دیکھئے۔ بیج میں کیا نظر آتا ہے؟ اس میں نہ کوئی شگوفہ ہے نہ وہ رنگینیاں ہیں۔ نہ وہ شاخیں اس کے اندر لہلہاتی ہیں نہ وہ برگِ درختانِ سبز ہیں۔ کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ بیج جب اچھی زمین میں پڑتا ہے اور اس کی آبیاری کی جاتی ہے تو اس میں سے ایک تنا نکلتا ہے۔ لیکن پہلے ضرورت ہوتی ہے کہ تنا مضبوط ہو کر آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ ہو جائے۔ اسلام بھی اسی طرح پھلا پھولا۔ جب یہ پودا بڑھا تو اس میں پھول نکلے اور پھل آنے شروع ہوئے۔ پھر اسی میں سے اعلیٰ درجے کی ادبیات نکلیں۔ اُس میں سے فلسفے کی شاخیں بھی پھوٹیں اور اسی میں سے تمام تعمیریں رونما ہوئیں اب ان تمام چیزوں کو دیکھ کر کوئی یہ کہے کہ بیج میں تو یہ نظر نہیں آتی تھیں۔ لہٰذا بیج کے منافی معلوم ہوتی ہیں۔ بھئی! ہر درخت کا گُل و ثمر بظاہر بیج کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ بیج میں کیا رکھا ہوتا ہے؟ اب اگر اسلام کو کوئی یہ سمجھ لے کہ وہ تو ایک بنا بنایا درخت تھا۔ بھان متی کے درخت کی طرح ایک ٹوکرے میں سے نکلا جس میں شاخیں بھی تھیں، گُل بھی تھے، ثمر بھی تھے۔ تو یہ تماشے والا قصہ نہیں تھا۔ اسلام ایک بیج تھا جو بویا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بیج میں سے کیا نکلا؟ اُس میں سے وہ تہذیب نکلی جس کے متعلق سب مانتے ہیں کہ وہ پہلی تمام تہذیبوں پر فائق تھی۔ پہلی تہذیبوں پر اس کو فائق کس نے کیا؟ پہلی تہذیبوں کے نمونے اور سانچے ڈھانچے جو موجود تھے ان پر اسلام کو فوقیت کس طرح حاصل تھی؟ اسلام کے تخم میں ذوقِ علم مضمر تھا۔ اسلام کے نزدیک اصل متقی اور اصل عالم وہ ہوتا ہے جو صبح و شام زمین و آسمان کے مظاہر پر غور کرتا رہے۔ عبادت کا یہ تخیل پہلے کہاں تھا؟ عبادت تو وہی تھی پوجا پاٹ کی قسم — اسلام

نے کہا ہے نہیں عبادت یہ نہیں ۔ عبادت یہ ہے کہ انسان مظاہر فطرت پر صبح و شام ، اُٹھتے ، بیٹھتے اور لیٹتے غور کرے اور اس کی کثرت میں خدائے لایزال کی وحدت کو تلاش کرتا رہے ۔

جسٹس رحمان :۔ غالباً حامد صاحب کو اس نظریے سے کچھ اختلاف معلوم ہوتا ہے کیا وہ کچھ ارشاد فرمائیں گے ؟

حامد علی خاں :۔ مجھے اور غالباً سالک صاحب کو بھی یہ اعتراض نہیں کہ اسلامی ثقافت کو آپ نے درویشانہ کیوں نہیں کہا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آپ نے صرف بیج کا ذکر کیا ہے۔ یعنی دینی تعلیمات اور مذہبی تصورات کا۔ میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے ثقافت کا جیسا کہ وہ بعد میں پیدا ہوئی اپنے مضمون میں کوئی ذکر نہیں کیا ۔

خلیفہ عبدالحکیم :۔ حامد علی صاحب بھی اسی غلطی کا شکار معلوم ہوتے ہیں جس میں اکثر لوگ مبتلا ہیں ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام بطور مذہب زندگی کے شعبوں سے کوئی الگ چیز ہے۔ اسلام میں مذہب کا وہ تصور ہی نہیں جو دیگر مذاہب میں ہے بلکہ میرے ایک دوست تو یہ کہا کرتے تھے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام مذہب ہی نہیں ۔ ان کا مقصد یہ تھا . . . .

جسٹس رحمان (قہقہے کے ساتھ) وہ کہتے ہیں یہ مذہب نہیں دین ہے !

خلیفہ عبدالحکیم :۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اسلام ایک عالمگیر تصورِ حیات ہے اور اُس میں دینی اور دنیوی تعلیم اور ظاہر و باطن کی تقسیم نہیں ہے۔ یہ تقسیمیں اس نے سرے سے مٹا دی تھیں ۔ مسلمان جس طرح خدا کو واحد سمجھتے تھے اسی طرح وہ زندگی کو بھی ایک وحدت بنانا چاہتے تھے ۔ ایک شخص ہے ۔ وہ شخص زندگی کا کاروبار بھی کرتا ہے ، کپڑا بھی بُنتا ہے اور سودا بھی بیچتا ہے ۔ وہی شخص رات کو عبادت کرتا ہے ، اور دن کو جہاد کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے ۔ پہلی جو تقسیمیں تھیں ان کے مطابق کوئی کپڑا بُننے والا سپاہی نہیں ہوتا تھا ۔ کوئی سپاہی راہب نہیں ہوتا تھا ۔ چنانچہ ابتدائے اسلام میں ایک شخص روما کی طرف سے مدینے آیا اور اُس نے واپس جا کر اپنے ملک میں بڑی دلچسپ رپورٹ کی ۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ان نئے لوگوں میں کیا خصوصیت ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ عجیب و غریب قسم کے لوگ ہیں ۔ اس نے کہا ـــــ فِي اللَّيْلِ رُهبانًا وَفِي النَّهَارِ رُكبانًا دن میں تو وہ جنگ جو سپاہی ہیں اور رات کو وہ راہب بن جاتے ہیں ۔ میرے خیال میں ذرا غور سے دیکھیے تو دن کا وہ جنگ جو اور رات کا وہ راہب دراصل ایک کپڑا بُننے والا جولاہا یا بڑھئی یا لوہار کا کام کرنے والا آدمی نظر آتا ۔

یہ چیزیں پہلے کسی چیز میں موجود نہ تھیں ۔ ہندوستان کے لوگوں نے تو اس میں حد کر دی ۔ انسانوں کو توڑنے اور ان کو تقسیم کرنے میں ان کے وظیفۂ حیات کو بڑا دخل تھا ۔ اسلامی تہذیب میں ایک ہی آدمی بہت سے کام کرتا ہے ۔ وہ یہ بھی ہوتا ہے اور کچھ اور بھی ہوتا ہے ۔ اور کچھ اور بھی ہوتا ہے ۔ یہ خصوصیت کئی سو برس کے بعد جمہوریت اور کسی نہ کسی قسم کی کشاکش کے بعد مغرب نے پیدا کی ہے کہ ہر شخص کو ہر چیز کرنے کا حق حاصل ہے ۔ یہ کیسی تقسیمیں بن گئی تھیں ؟ یہ اسلام ہی کا فیضان ہے کہ پانچ چھ سو سال کے بعد تجربے کے بعد اُس نے ایک نیا نمونہ دنیا کے سامنے چھوڑا جو رفتہ رفتہ

دوسری قوموں میں بھی سرایت کر گیا۔ آج ایسی چیزوں کو آپ جمہوریت کہہ رہے ہیں۔ یہ خاص اسلام کا عطیہ ہے جو نوعِ انسان کو دیا گیا۔

جسٹس رحمان: ۔ ڈاکٹر برہان الدین احمد صاحب کیا آپ اس مسئلے پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں؟

ڈاکٹر برہان الدین احمد: ۔ مجھے جناب خلیفہ صاحب سے یہ دریافت کرنا ہے کہ اسلامی تہذیب جس کی تعلیمات آپ نے بیان فرمائیں وہ کس طرح زندگی میں سرایت کر گئیں اور جو نتیجۃً زندگی کا انداز پیدا ہوا کیا وہ اسلامی تہذیب ہے یا اسلام خود اسلامی تہذیب ہے؟ اس باب میں ایک خیال مفکرین یورپ کی طرف سے آیا ہے کہ وہ اسلام کو ایک تہذیب قرار دیتے ہیں۔ اس سے ایک مایوسی سی پیدا ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی تہذیب ایک دفعہ زوال پذیر ہونے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوئی۔ تو کیا اسلامی تہذیب اور اسلام کے درمیان کوئی امتیازی فرق ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا اسلامی تہذیب کی تجدید ممکن ہے یا نہیں اور کیا اسلامی تہذیب برخلاف دوسری تہذیبوں کے اپنے اندر اپنی تجدید و احیاء کا کوئی حتمی اور قطعی اصول بھی رکھتی ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنا اعادہ کر سکے؟

خلیفہ عبدالحکیم: ۔ ڈاکٹر برہان الدین احمد صاحب نے جو سوال کیا ہے۔ اُس کا مختصر جواب جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا یہ ہے کہ تہذیب اور تمدن میں ذرا فرق کر لینا چاہیئے۔ یورپ والے نہیں کرتے۔ اس لیے وہ ملا جُلا کر اسے سویلزیشن (CIVILIZATION) کہتے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ تصوّر ہے کہ ہر کلچر کا ایک ڈھانچا ہوتا ہے جس کی ایک مدت ہوتی ہے اور وہ ڈھانچا جب اپنی مدت ختم کر چکتا ہے تو پھر دہرایا نہیں جاتا اور ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے قرآن کریم میں اکثر مرتبہ یہ آیت پڑھی ہوگی اور بعض لوگوں نے اس پر غور بھی کیا ہوگا۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ اور یہ بھی فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ ۔ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۔ ہر اُمّت کے لیے ایک اجل، کچھ وقت مقرر ہے جس میں وہ پیدا ہوتی، پرورش پاتی اور پھر آخر ختم ہو جاتی ہے اور جب وہ ختم ہونے لگتی ہے تو پھر کوئی اسے سنبھال نہیں سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ کسی خاص اُمّت کے لیے نہیں بلکہ سب اُمّتوں کے لیے ہے وہ کہتا ہے وَلِكُلِّ أُمَّةٍ یعنی اس نے ایک کُلیہ بیان کیا ہے۔ جس میں کوئی استثنا نہیں۔

جسٹس رحمان: ۔ معاف کیجئے خلیفہ صاحب! کیا میں اس کا مطلب یہ سمجھوں کہ اُمّتِ مسلمہ ختم ہو گئی؟

خلیفہ عبدالحکیم: ۔ نہیں میں ابھی اس کی طرف آنے والا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس اُمّت کو بھی ختم ہو جانا چاہیئے تو اس سے شاید بعض لوگوں کو خیال پیدا ہو کہ یہ ختم ہو چکی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ڈاکٹر برہان احمد صاحب کے سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور تمدن کے مختلف ظاہری سانچے دیکھے جائیں تو یہ سب مل کر کسی ایک سانچے کا نام نہیں ہے۔ اسلام تو ایک میلانِ حیات ہے۔ ایک TREND (رُجحان) کہ زندگی کو کس طرف جانا چاہیئے۔ اُس طرف جاتے ہوئے وہ رستے میں کئی نئے سانچے اور ڈھانچے پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی مختلف اقوام ان چودہ سو

برس میں مختلف ممالک میں مختلف قسم کے کلچر کی زندگی بسر کر چکی ہیں۔ اس وقت اگر انگریز مسلمان ہو جائیں تو ان کے تہذیب و تمدن مل جل کر بہر حال آپ کے قبائلی مسلمانوں کی تہذیب سے کوئی مماثلت نہیں رکھیں گے لیکن جسے اسلام کہتے ہیں وہ اُن امتوں کی تہذیبوں اور تمدن کے سانچوں وغیرہ سب سے ماورا ایک چیز ہے۔ یہ سانچے یونہی بنتے رہتے ہیں اور زمانہ پھر انہیں توڑتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ لازم نہیں ہے کہ جو سانچے ڈھانچے مسلمانوں کے شروع میں بنے تھے وہ جوں کے توں قائم رہیں مثلاً رسول اللہؐ کے زمانے میں جو سانچے بنے تھے حضرت عمرؓ کے زمانے میں اُن میں کئی تبدیلیاں ہو گئیں اور ذرا اور آگے بڑھیئے تو بنی امیہ کے ہاں وہ کچھ سے کچھ ہو گئے اور پھر عباسیوں کے ہاں جہاں اس میں بہت سے عجمی آ گئے تھے اسلامی تہذیب نے ایک اور رنگ اختیار کیا۔

جسٹس رحمان: ۔ خلیفہ صاحب میاں بشیر احمد صاحب یہاں تشریف فرما ہیں اور ان کا ایک سوال ہے، آپ سُن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی خوبیاں مسلّمہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ خوبیاں اب مسلمانوں میں کیوں نہیں ہیں اور کس طرح پھر پیدا کی جا سکتی ہیں؟ وہ کہتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ جب تک کسی نہ کسی طرح چند افراد ان خوبیوں کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے نہ آ جائیں اس سوال کا جواب نہ مل سکے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

خلیفہ عبدالحکیم: ۔ ..... میں تو میاں بشیر احمد صاحب سے سو فی صدی متفق ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی فرد یا کسی قوم کی حالت خراب ہو جائے تو پھر اس کا احیاء کیسے کیا جائے؟ یہ بہت بڑا سوال ہے اور اس کا جواب وہی ہے جو خود انہوں نے بیان کر دیا۔ اگر ہماری قوم میں انقلاب سا پیدا ہو کر کچھ لوگ ایک مثالی زندگی بسر کرنے لگیں تو اس سے باقی ملت بھی لازم طور پر متاثر ہو کر اُبھرنے لگے گی۔ ہمارے سامنے اور قوموں کی مثال موجود ہے۔ چینی ہوں یا روسی ان میں چند افراد تھے جو ایک خاص قسم کا نظریۂ حیات رکھتے تھے۔ انہوں نے اس میں وسعت پیدا کی اور اس کے لیے زبردست قربانیاں کیں اور ایثار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بطورِ خمیر ساری قوم میں سرایت کر گئیں اور پھر بیس یا چالیس یا پچاس کروڑ آدمی آپ کے دیکھتے دیکھتے اسی رنگ میں رنگے گئے۔ اب ہمارے ہاں یہ لوگ کیسے پیدا ہوں؟ بھئی! یہ سوال ایسا ہے کہ اس کا جواب ایسا ہی مشکل ہے جیسا قیامت کے سوال کا جواب۔ رسولِ کریمؐ سے لوگ پوچھتے تھے کہ قیامت کب ہو گی؟ تو آپؐ جواب میں فرماتے تھے کہ اس کا علم جس سے پوچھتے ہو اس کو بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اب یاد رکھیئے کہ آپ کے سامنے نمونہ موجود ہے۔ تُرک قوم کی جو حالت تھی دینی، معاشرتی اور اقتصادی وہ اس انقلاب سے پہلے کچھ ہم لوگوں سے بہتر نہ تھی بلکہ بعض لحاظ سے شاید بدتر ہی معلوم ہوتی تھی لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے اس قوم میں کیسا شاندار نظم و ضبط پیدا ہوا؟ آپ تو ترکی میں سفیر رہ چکے ہیں اور میں بھی گذرتے ہوئے اس کا کچھ نہ کچھ نقشہ دیکھ چکا ہوں۔ اب اس قوم میں حب الوطنی اور تنظیم کے آنے سے بددیانتی خیانت وغیرہ کا قلع قمع ہو گیا ہے۔ اب وہاں یہ باتیں کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ سب

چیزیں آپ کے سامنے ہیں۔ تو میں پلٹا کھاتی ہیں۔ اب یہ کہ وہ کن کن اسباب سے پلٹا کھاتی ہیں یا کھائیں گی اور یہ سب کچھ کیسے ہوگا تو بعض اوقات یک بیک "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"۔ تو مردے از غیب کس وقت آتا ہے اس کے متعلق غیب ہی کو علم ہے اور غیب داں ہی کو علم ہو سکتا ہے!

جسٹس رحمان: خلیفہ صاحب یہ جو اسلامی ممالک میں صوفی تحریک چلی۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ اسلامی افکار کے بالکل مطابق تھی یا اس سے کچھ مختلف؟

خلیفہ عبدالحکیم: جسٹس رحمان نے اتنا بڑا سوال کر ڈالا کہ اب اس کے لیے پوری رات کی مہلت ہو تو کچھ کہا جائے۔ قصہ صرف یہ ہے کہ جسے تصوف کہتے ہیں وہ کوئی ایک چیز نہیں ہے۔ شروع میں جو بعض ذرا زیادہ زاہد قسم کے لوگ تھے وہ دین کے پورے پابند اور آرام اور عیش و عشرت کی زندگی سے بالکل متنفر تھے۔ یہی ابتدائی صوفی شمار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ دینی زندگی میں بعض لوگوں میں ایک خاص قسم کی گہرائی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ اسلام کا پہلا دور دورِ عمل تھا۔ اگر اسلام ابتدا ہی میں ایسے صوفی پیدا کرتا جو اپنے نفس کے اندر غوطے لگا کر اس کے متعلق تمام احوال اور باطن کے تمام مقامات کی چھان بین شروع کر دیتے تو مسلمانوں کے ہاتھوں وہ عظیم الشان کام نہ ہوتے جو ہوئے۔ اسلام کا یہ دور اصلاحِ سیرت اور کردار کا دور تھا جب دین علم مردہ شویاں ہوگیا تو ...... (قہقہے) ....

جسٹس رحمان: خلیفہ صاحب قطع کلام ہوتا ہے اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ دو فرقے پیدا ہو گئے افراط و تفریط کے شکار یعنی ایک تو ظاہر پرست اور دوسرے صوفی لوگ جو بالکل نفس میں ڈوب کے رہ گئے۔

خلیفہ عبدالحکیم: یہ آپ درست کہتے ہیں کہ ہر افراط کے ساتھ تفریط تو ردِعمل کے طور پر پیدا ہو ہی جاتی ہے چنانچہ باطن میں ڈوبنے والے بعض ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں کہ وہ آپ نے قصہ سنا ہوگا ایک بڑے صوفی کا جس سے کسی نے آکے پوچھا کبھی تم بادشاہ کے پاس کیوں نہیں جاتے؟ تو اس نے کہا "باخدا چناں مشغولم کہ از رسول مخیالت یاد آرم تا بہ اولوالامر چہ رسم"۔ یہ دوسرا ردِعمل تھا۔ چنانچہ یہ باطنیت اتنی دور چلی گئی کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کے بہت سے عناصر اس میں داخل ہو گئے اور ہمارے ہاں ایک عجیب و غریب قسم کا تصوف پیدا ہو گیا۔ اس کے خلاف علامہ اقبال نے جو فطرتاً صوفی تھے اور جن کے کلام کا بہترین حصہ اصل میں تصوف کا بہترین حصہ ہے اپنی آواز بلند کی۔ اقبال کو تصوف نے بہکایا نہیں بلکہ تصوف میں حقیقت کے جو عناصر تھے وہ ان کی طبیعت میں جذب ہوئے اور ان کے کلام میں ابھرے اقبال نے انہیں اسلامی شریعت اور اسلامی مقاصدِ حیات کے ساتھ وابستہ کیا جس سے وہ مدتیں ہوئیں الگ ہو چکے تھے۔

جسٹس رحمان: خلیفہ صاحب بہت بہت شکریہ اِن توضیحات کا۔ میرے خیال میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اس بحث کو ختم کر دیا جائے کیونکہ حضرت اقبال نے جو کچھ فرما دیا وہ حرفِ آخر سمجھا جانا چاہیئے!